

رالف رسل

راسخ کمیونسٹ، سنجیدہ محقق اور عاشقِ زندگی

رالف رسل سے میں پہلی بار دس برس قبل ۱۹۹۸ میں ملی تھی۔ لیکن اس ملاقات کو یک طرفہ ملاقات کہنا ہی زیادہ بہتر ہوگا۔ جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے اسکول آف لینگویج کے کمیٹی روم میں رالف کا لیکچر تھا۔ اردو کے بارے میں ان کے نجی تجربات کے حوالے سے۔ لیکچر کا اہتمام لٹریچر کلب نے اطہر فاروقی کے توسط سے کیا تھا۔ رالف رسل تقریر کرنے کھڑے ہوئے تو انھوں نے پہلے ہی جملے میں اپنے کمیونسٹ ہونے کا اعلان کیا اور کہا کہ ان کی گفتگو کے حوالے سے اس بات کو ذہن نشین رکھا جائے۔ اس کے بعد انھوں نے بڑی فصیح اردو میں ایک طویل لیکچر دیا۔ میری طرح غالباً سبھی لوگ ”رالف رسل کیا کہہ رہے ہیں“ سے زیادہ ”کیسی زبان میں کہہ رہے ہیں“ کے سحر میں گرفتار تھے۔ صاف پتا چل رہا تھا ہر شخص مرعوب ہے۔ پروگرام کے بعد ہر کوئی ان سے ملنا چاہتا تھا۔ (مجھے یاد ہے اس موقع پر ہمارے مرکز کے ایک استاد نے اپنی وہ کتاب بھی انھیں تبصرے کی درخواست کے ساتھ پیش کی تھی جو غیر اردو دانوں کو اردو سکھانے کے لیے تیار کی گئی تھی اور جس پر انہی دنوں پروفیسر چودھری محمد نعیم کا تبصرہ و سائنس یونیورسٹی کے ”سالنامہ دراساتِ اردو“ میں اس کمنٹ کے ساتھ شائع ہوا تھا کہ یہ کتاب ان لوگوں کے لیے لکھی گئی ہے جو اردو نہیں جانتے لیکن اس کو صرف وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو اردو جانتے ہیں۔ لطف کی بات یہ تھی کہ یہ تبصرہ ان دنوں سینٹر میں ہر شخص کے لیے گفتگو کا موضوع بنا ہوا تھا، ایسے میں زبان سکھانے والے کسی ماہر استاد کو کتاب پیش کرنا واقعی حوصلے کی بات تھی!)۔ خیر، رالف رسل جیسے تیسے وہاں سے نکلے۔ دوپہر کے کھانے کا انتظام ارولی گیٹ ہاؤس میں تھا، وہاں پہلی مرتبہ رالف رسل سے باقاعدہ تعارف ہوا۔ انھوں نے بھی اخلاقاً میری تعلیم اور دل چسپیوں کے بارے میں ایک آدھ سوال کیا۔ کھانے کے بعد ہم لوگ صدر دروازے کی سیڑھیوں پر بیٹھ گئے اور طالب علموں میں بائیں بازو کے نظریات کی اشاعت اور کیپس کی سیاست پر باتیں

کرنے لگے۔ چلتے وقت انھوں نے اپنی ڈائری میں ہینسل سے میرا پتا لکھا۔ ابھی میں ہینسل کو دیکھ کر حیران ہی ہو رہی تھی کہ انھوں نے وضاحت کی، ”لوگوں کے پتے میں ہینسل سے لکھتا ہوں۔ بعد میں جن سے رابطہ رہتا ہے ان کے پتے روشنائی سے لکھ لیتا ہوں، جن سے رابطہ نہیں رہتا ان کے پتے مٹا ڈالتا ہوں۔“

لیکچر سے لے کر اب تک ان کی شخصیت کے دو گوشے میرے سامنے نمایاں ہو چکے تھے۔ اول یہ کہ اپنے کمیونسٹ ہونے پر انھیں ناز ہے اور اس کا اعلان وہ بھری محفل میں بھی بلا جھجک کر سکتے ہیں، بل کہ فخر یہ کرتے ہیں، دوم یہ کہ وہ بہت ڈسپلن میں رہتے ہیں اور یہ ڈسپلن ان کی واضح فکر اور معمولی سے معمولی بات پر سنجیدہ غور و فکر کا نتیجہ ہے۔ ہم جیسے بے ترتیب زندگی گزارنے والوں کے لیے یہ جاے حیرت تھی کہ پتا لکھنے تک میں اتنا اہتمام برتا جائے۔ البتہ یہ تمام باتیں اُس وقت میرے ذہن میں نہیں آئیں بل کہ اس کے برعکس میں نے سوچا— ہوں! تو یہ ہے ایک انگریز کی تنگ مزاجی! یہ لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں۔

رالف رسل نے وعدہ کیا کہ وہ مجھے اپنی کتاب بھیجیں گے۔ میں نے ان کو خط لکھا اور انھوں نے مجھے اپنی کوئی کتاب بھیجی اور اس طرح مجھے پتا چلا کہ میرا پتا ان کی ڈائری میں کبھی سیاہی والے پتوں میں شامل ہو گیا ہے۔

جب انھوں نے ۲۰۰۲ میں اپنی خودنوشت *Findings Keepings: Life, Communism & Everything* کی کاپی بھیجی، اس وقت تک میں ان کے ایک مضمون کا اردو ترجمہ کر چکی تھی جو ہندوستان میں اردو کی صورت حال کے بارے میں تھا۔ سوانح پڑھنی شروع کی تو اتنی دل چسپ لگی کہ میں نے سوچا اس کے کچھ صفحے اردو میں ترجمہ کر کے شائع کراؤں۔ چنانچہ پہلے باب کا ترجمہ کرنے سے خود کو نہ روک سکی اور یہ کام خوب دل لگا کر کیا۔ اگست کے مہینے میں میں نے ترجمہ کا ایک پرنٹ آؤٹ ڈاک سے رالف رسل کو بھیجا اور ای میل سے ان کو اطلاع دے دی۔ چند دن کے بعد ان کا جواب آیا کہ ترجمہ مل گیا ہے لیکن آئندہ پندرہ دن تک نہیں پڑھوں گا کیوں کہ فلاں فلاں کاموں میں مصروف ہوں۔ تیسرے دن پھر ایک ای میل آیا کہ لندن سے فلاں شہر جاتے ہوئے سفر کے دوران ترجمہ پڑھ ڈالا ہے۔ مجموعی طور پر انھوں نے ترجمہ بے حد پسند کیا اور تجویز رکھی کہ میں لندن میں رہ کر سوانح کا ترجمہ کر ڈالوں۔ ظاہر ہے سفر اور قیام کے اخراجات انھیں کو برداشت کرنے تھے۔ جواباً میں نے لکھا کہ ترجمہ کرنے کے لیے ان کے ساتھ بیٹھنا بالکل ضروری نہیں ہے، بل کہ ہندوستان میں رہ کر یہ کام زیادہ بہتر طریقے سے ہو سکتا ہے۔ البتہ اتنا ضرور کیا جاسکتا ہے کہ کام مکمل ہونے کے بعد ساتھ ساتھ اس پر نظر ثانی کر لی جائے۔ رالف کو تجویز پسند آئی اور میں نے ترجمہ کرنے کا وعدہ کر لیا۔

انھی دنوں نومبر ۲۰۰۲ میں مجھ کو دہلی یونیورسٹی میں ملازمت مل گئی تو نئی ذمے داریوں میں مصروف ہو

جانے کی وجہ سے ترجمے کا کام ملتوی رہا لیکن ۲۰۰۳ کے موسم گرما کی تعطیلات میں میں نے اس کام کو نمٹایا اور ۲۰۰۴ کی چھٹیوں میں لندن جا پہنچی۔ تقریباً مہینہ بھر مجھے رالف رسل کے ساتھ رہنے اور انھیں سمجھنے کا موقع ملا۔ بل کہ یوں کہوں تو زیادہ بہتر ہوگا کہ ان کی شخصیت کو سمجھنے کا موقع تو سوانح پڑھنے سے ہی مل گیا تھا، ساتھ ساتھ کام کرنے سے قریبی مشاہدے اور ان اوصاف کو پرکھنے کا موقع ملا جن کا تاثر سوانح پڑھ کر ملتا ہے۔ ویسے بھی رالف رسل کی شخصیت میں کوئی پیچیدگی نہیں۔ میں نے محسوس کیا کہ ان کا باطن آئینے کی طرح صاف ہے اور جس بات کو درست سمجھتے ہیں اسے بڑے پرزور انداز میں اور صاف گوئی کے ساتھ کہہ ڈالتے ہیں۔ یہ بات ان کی سوانح سے بھی مترشح تھی، ساتھ رہ کر اس کی توثیق ہوگئی۔ میں ۸ جون کو لندن پہنچی تھی، ۹ جون کو ہم نے ترجمے پر مشترکہ طور پر نظر ثانی کا کام شروع کیا اور ۲۹ جون تک، ۲۱ دن کی مدت میں تقریباً ۴۵۰ صفحے کے اس مسودے کو پڑھ ڈالا، کم زور جملوں پر تبادلہ خیال کیا، زبان درست کی اور کمپیوٹر پر اغلاط کی تصحیح کے بعد اسے اشاعت کے لیے اجمل کمال کو کراچی بھیج دیا۔ اپنے اس قیام کی کچھ یادداشتیں میں نے ایک مضمون کی صورت میں لکھی ہیں جو رالف رسل کی سوانح کے اردو ترجمے ”جوئندہ یا بندہ“ کے آخر میں شامل ہے، لیکن بہت سی اور بھی باتیں ہیں جو لکھی جاسکتی ہیں۔ مثلاً ایک دن رالف رسل نے مجھ سے پوچھا کہ میں نے ترجمہ کتنے دن میں مکمل کیا اور میں کتنے گھنٹے روز کام کرتی تھی۔ میں نے حساب لگا کر بتایا کہ ۲ مئی سے ڈھائی مہینے تک میں نے ہر روز کام کیا ہے اور سہ ماہی چھ گھنٹے ہر دن کام کرتی تھی۔ چند دن کے بعد پھر کہنے لگے کہ تم نے اس سوانح کا ترجمہ کر کے مجھ پر جو احسان کیا ہے اس کا نہ تو شکریہ ادا کیا جاسکتا ہے اور نہ اس کا کوئی بدل ہے۔ تم نے ترجمے پر ساڑھے سات سو گھنٹے صرف کیے ہیں۔ اپنی زندگی کے اتنے ہی گھنٹے میں تمہارے لیے وقف کرنے کو تیار ہوں۔ مجھ سے جو کام لینا چاہو لے سکتی ہو، جیسے اپنے مضامین ترجمہ کرا سکتی ہو۔

مجھے ہنسی آگئی۔ یہ رالف کا بڑا اٹیٹیکل انداز تھا کہ وہ کسی صورت حال کو جتنی شدت سے محسوس کرتے اسی شدت سے اسے بیان کرنے پر بھی اتنی ہی قدرت رکھتے تھے۔ میں نے کہا بھی ترجمہ میں نے آپ پر احسان کرنے کے لیے نہیں کیا ہے، کتاب پسند آگئی تھی کر دیا، آپ بالکل زیر بار محسوس نہ کریں۔ کہنے لگے، پھر بھی مجھے خوشی ہوگی اگر میں تمہارے لیے کام کر سکوں۔ ان کو میرا ایک مضمون بہت پسند آیا تھا جو ”کتاب نما“ میں دہلی سے مہمان ادارے کے طور پر شائع ہوا تھا۔ کہنے لگے میں اس مضمون کا ترجمہ کروں گا۔ میں نے پھر کہا کہ بالکل ضرورت نہیں ہے، اس سے زیادہ ضروری کام یہ ہے کہ آپ اپنی سوانح کے بقیہ حصوں پر کام کرتے رہیں۔ ان کے خلوص کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ انھوں نے اس کے بعد بھی کئی بار اصرار کیا لیکن میں نے ہر بار انکار

کر دیا۔ مجھے یہ گوارا نہ تھا کہ ۸۶ برس کی عمر میں وہ ان کاموں کو وقت دیں جو ان کی پلاننگ میں پہلے سے شامل نہیں ہیں۔

پلاننگ پر یاد آیا کہ رالف رسل نے ہمیشہ بڑی منضبط زندگی گزاری۔ ان کی زندگی کے کچھ معمولات ایسے رہے کہ نوے برس کی عمر تک ان میں سرمو فرق نہیں آیا۔ ان میں سے ایک معمول جرنل لکھنے کا ہے یعنی ڈائری نویسی کا۔ آخری چند برسوں میں وہ ہفتے بھر کی (یا کبھی پندرہ دن کی) روداد اپنے چند عزیزوں اور دوستوں کو ای میل کے ذریعے بھیجتے رہے۔ (ڈائری وہ بول کر ٹائپ کراتے تھے۔ ایک جرمن خاتون اُرسلا برگ ہاؤز ہفتے میں دو بار اس کام کے لیے آتی تھیں)۔ اس روداد میں ان کی صحت کا احوال تفصیل کے ساتھ درج ہوتا تھا۔ مثلاً کس دن طبیعت غیر معمولی طور پر اچھی یا بری محسوس ہوئی، ڈاکٹر سے ملاقات کیسی رہی، بابوش کے ساتھ وقت کیسا گزرا (بابوش وہ نرس ہے جو ان کی دیکھ بھال کے لیے روزانہ چند گھنٹے کے لیے آتا تھا)، کس ہفتے کون سی کتاب پڑھی، کتاب کیسی لگی، کون کون لوگ ملنے آئے (نئے ملنے والوں کا تعارف بھی جرنل میں شامل ہوتا تھا)، وہ خود کہاں کہاں گئے، بازار سے کیا خریدا، کون سے پارک کی سیر کی، ویک اینڈ کیسا گزرا، وغیرہ وغیرہ۔

اپنے حالات اور گرد و پیش کے بارے میں لکھنا انھوں نے چوبیس برس کی عمر میں اس وقت شروع کیا تھا جب وہ دوسری جنگ عظیم کے دوران لازمی فوجی خدمت پر ہندوستان بھیجے گئے تھے۔ ۱۹۳۹ میں جب جنگ چھڑی تو رالف رسل بی۔ اے۔ کے طالب علم تھے (۱۹۳۰ میں تعلیم مکمل ہوتے ہی انھیں فوجی ٹریننگ پر بھیج دیا گیا تھا اور مارچ ۱۹۴۲ میں ہندوستان کے محاذ پر)۔ پوسٹنگ آسام میں ہوئی تھی اور محاذ پر سے وہ اپنے عزیزوں کو پابندی سے خط بھیجتے اور کوشش کرتے تھے کہ یہاں کا احوال بالتفصیل لکھیں، احوال لکھنے کا یہی شوق عادت میں بدل گیا اور اگست ۱۹۴۵ میں برطانیہ لوٹنے پر باقاعدہ ڈائری لکھنے لگے۔ یہ عادت آخر عمر تک برقرار رہی۔ انھوں نے بتایا تھا کہ اسی ڈائری کی وجہ سے وہ اپنی سوانح اتنی تفصیل کے ساتھ اور اتنے مربوط انداز میں لکھنے میں کامیاب ہو سکے۔

رالف کے ہاں قیام کے دوران ہماری گفتگو کا موضوع عام طور پر رالف کے حالات زندگی، ہندوستان میں ان کے تجربات وغیرہ ہوتے۔ اردو کے معروف لوگ جو ان کے رابطے میں رہے، رالف ان کے بارے میں بتاتے، ان میں سے اکثر باتیں بڑی دل چسپ ہوتیں۔ کبھی کبھی ہندوستان کی سیاسی صورت حال، کمیونسٹ پارٹی اور جے این یو میں طلبہ کی سیاسی سرگرمیاں، سیاست سے میری وابستگی وغیرہ پر بھی بات ہوتی۔ صبح سے دوپہر تک ہم لوگ ترجمے پر کام کرتے۔ لُنج کے بعد ہم لوگ عموماً چھوٹا سا بریک لیتے تھے اور جلد ہی دوبارہ کام

کرنے بیٹھ جاتے۔ بعض دفعہ جب کام کو جی نہ چاہتا تو رالف کہتے، ”میں اب قیلولہ فرماؤں گا۔“ ایسا وہ طنزاً کہتے تھے کیوں کہ ”فرمانا“ جیسے لفظوں کے استعمال کو وہ معیوب سمجھتے تھے۔ کبھی کبھی وہ اپنے چھوٹے موٹے لیکن ضروری کام کرنا چاہتے تو کہتے تھے، "Now I'll do my little fat works." (چھوٹے موٹے کاموں کا لفظی ترجمہ رالف نے یہی کر رکھا تھا)۔

رالف کی ایک خوبی یہ تھی کہ وہ جس شخص سے بھی ملتے اسے شخصی طور پر سمجھنے کی پوری کوشش کرتے تھے اور اس کے پس منظر کو بھی۔ انھوں نے مجھ سے بھی میرے حالات معلوم کیے، میرے وطن سکندر آباد کے بارے میں پوچھا، دہلی سے کتنی دور ہے، کس سمت میں، کتنی آبادی ہے، مسلمان اور ہندو آبادی کا تناسب کیا ہے، دونوں فرقوں کے آپسی رشتے کیسے ہیں، معاشی اور تعلیمی صورت حال کیا ہے، میرے خاندان میں کون کون لوگ ہیں، ان کا ذریعہ معاش کیا ہے، لڑکی ہو کر ایک چھوٹے سے قصبے میں کیوں کر اپنی تعلیم جاری رکھ سکی، وغیرہ وغیرہ۔ میں نے ان کے سب سوالوں کا جواب (جو غالباً تسلی بخش ہی ہوگا) دیا۔ اس میں سے انھوں نے بہت سی باتیں اپنے روزنامے میں درج کر لیں۔

رالف کے گھر میں قیام کے دوران میں نے یہ بھی مشاہدہ کیا کہ بہ حیثیت استاد رالف رسل نے کس قدر سنجیدگی اور دل چسپی سے اپنی ذمہ داریاں نبائی ہوں گی۔ میں نے دیکھا کہ ان کے پاس آڈیو کیسٹس کا ایک بڑا ذخیرہ ہے جس میں وہ تمام مواد ریکارڈ ہے جس کی مدد سے وہ سوائس (School of Oriental and African Studies) میں اپنے طالب علموں کو اردو سننے، سمجھنے اور بولنے کی مشق کراتے تھے۔ زبان دانی کے مختلف سطح کے کورسوں کے لیے الگ الگ ٹیپ ہیں جن کا ایک باقاعدہ کیٹلاگ بنا رکھا تھا۔ اس تدریسی مواد میں فیض احمد فیض، ظ انصاری اور شفیع الدین نیر اور صوفی تسم وغیرہ کے وہ انٹرویوز بھی شامل ہیں جو رالف نے سوائس کی لینگویج لیب میں خود ریکارڈ کیے تھے۔ فیض کا انٹرویو عبادت بریلوی نے لیا تھا۔ اس کے علاوہ غالب، میر، سودا وغیرہ کا کلام تحت الفظ اور ترنم میں رکارڈ کیا ہوا ہے۔ اس میں غزلوں کے علاوہ مثنویاں اور مرثیے بھی شامل ہیں؛ افسانوں اور ناولوں کے اقتباسات کے ریکارڈ ہیں؛ ہندستان پاکستان کے دیہات، قصبوں، شہروں کے طرز معاشرت پر، فرقہ وارانہ فسادات، مذاہب و عقائد، موسیقی اور دیگر بہت سے موضوعات پر گفت گو اور انٹرویوز شامل ہیں۔ یہ سب اچھے اردو دانوں اور معروف اساتذہ کی آوازوں میں ہیں، مثلاً چودھری محمد نعیم، خالد حسن قادری، خورشید الاسلام اور عبادت بریلوی وغیرہ۔ آڈیو کیسٹس کی یہ اہم لائبریری رالف کی زندگی بھر کی لگن، محنت اور ایک فرض شناس استاد کے غور و فکر کے ساتھ مسلسل کام کرنے کی عادت اور تعلیمی معیار کو بہتر سے

بہتر بنانے کی کوششوں کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

سوانح پر نظر ثانی کا طریقہ ہم نے یہ اختیار کیا تھا کہ میں اردو متن پڑھتی جاتی تھی اور رالف انگریزی متن دیکھتے جاتے تھے، جہاں ترجمہ درست نہ لگتا یا کم زور لگتا اس کو ٹھیک کرتے تھے۔ جس میز پر یہ کام کرتے تھے اس کے سامنے بڑی سی کھڑکی تھی جو سڑک کی جانب کھلتی تھی۔ ایک دن ہم بیٹھے ہوئے اسی طرح کام کر رہے تھے، میں کسی جملے کو نئے سرے سے ترتیب دینے میں مصروف تھی اور رالف غالباً سڑک کی طرف دیکھ رہے تھے کہ اچانک بول اٹھے، ”اوہ ہو... ہو... پریاں... ننھی پری...“ میں نے جلدی سے نظر اٹھائی۔ سڑک پر چھوٹی چھوٹی بچیاں اسکول کی سفید یونی فارم میں ملبوس گزر رہی تھیں۔ ان کے پیچھے پیچھے قبول صورت سی ایک عورت بھی تھی جو غالباً اسکول کی آیا رہی ہوگی اور بچیوں کو ان کے گھر سے لانے لے جانے کا کام کرتی ہوگی۔ میں نے مسکرا کر پوچھا کیا وہ آپ کو بہت خوب صورت لگی؟ کہنے لگے، ”وہ تو بے جان تھی۔ میں تو سفید لباس والی پریوں کی بات کر رہا ہوں۔ چھوٹی پریوں کی۔“ مجھے لفظ ”بے جان“ پر بہت ہنسی آئی تو انھوں نے وضاحت کی کہ خورشید الاسلام نے خوب صورتی اور کشش کے اعتبار سے عورتوں کو تین زمروں میں تقسیم کر رکھا تھا: جان، نیم جان اور بے جان۔ جب رالف نے ماسکو میں اپنے ایک دوست حبیب الرحمن کو یہ زمرے بتائے تو انھوں نے برجستہ کہا، ”اس میں ایک اور زمرے کا اضافہ کرلو— اماں جان۔“

ہر بدھ کی شام آٹھ بجے رالف کے پاس کچھ طالب علم اردو سیکھنے آتے تھے اور ہر دوسری جمعرات کی شام کو ہندی سیکھنے۔ یہ لوگ یزبانیں بولنے کی مشق کے لیے آتے تھے۔ ان میں سے کچھ طالب علم انگریز ہوتے تو کچھ کا تعلق یورپی ممالک مثلاً جرمنی وغیرہ سے ہوتا۔ بولنے کی مشق کی یہ کلاسیں بھی خاصی دل چسپ ہوتی تھیں اور ان سے مجھے یہ بھی پتا چلا کہ یورپی لوگوں کو وقت شق کی درست ادائیگی میں نہیں بل کہ ”ب“ اور ”بھ“، ”ک“ اور ”کھ“ جیسی آوازوں کے درمیان تفریق میں اور ان کو واضح طور پر ادا کرنے میں ہوتی ہے۔

رالف نہایت شستہ اردو بولتے تھے لیکن اردو بولنے کی مشق کے زیادہ مواقع نہ ملنے کے سبب ان کو بھی تلفظ کی ایسی ہی دقتیں پیش آنے لگی تھیں جو ان کے شاگردوں کو لاحق تھیں۔ مثلاً ایک دن وہ اپنی دوست میرین مولینو کی عیادت کر کے لوٹے (جن کے پتے کا آپریشن ہوا تھا) تو مجھے بتانے لگے کہ اسپتال میں میرین کے برابر والے بستر پر جو عورت لیٹی تھی اس نے میرین کو بتایا کہ آپریشن کے بعد اس کے جسم میں ایسے درد ہو رہا ہے گویا کسی گورے نے زور سے لات ماری ہو۔ یہ واقعہ سنا کر رالف خود ہی دیر تک ہنستے رہے اور مجھے بھی اس عورت کی گفت گو کے اس عجیب و غریب انداز پر حیرت ہوئی اور ہنسی بھی آئی۔ مجھے لگا کہ سابق کالونیوں کے کچھ لوگ شاید

اب بھی انگریزوں سے شدید نفرت کرتے ہیں۔ شام کو جب اردو کی مشق والی کلاس شروع ہوئی تو رالف نے اپنے ایک شاگرد ڈیوڈ جیج کو (جو بی بی سی ورلڈ سروس کے انچارج رہ چکے تھے، اور رائرمنٹ کے بعد اردو بولنے کی مشق کر رہے تھے) یہی واقعہ اردو میں ایک مرتبہ پھر سنایا۔ اب مجھ سے نہ رہا گیا اور میں پوچھ بیٹھی، ”رالف! کیا وہ عورت افریقی نسل کی کالی عورت تھی؟“ اب حیرت زدہ ہونے کی باری رالف کی تھی، ”کیا مطلب؟“ انھوں نے پوچھا۔ میں نے وضاحت کی، ”اگر وہ کالوں کی کسی نسل سے تعلق نہیں رکھتی تھی تو پھر گوروں کا ذکر اتنی نفرت سے کیوں کر رہی تھی!“ اب جا کر رالف کی سمجھ میں میری بات آئی اور انھوں نے پوری احتیاط سے لفظوں کو ادا کرتے ہوئے کہا، ”اچھا تو میں نے ’گورا‘ کہا ہے! لیکن میری مراد تو ’گھوڑے‘ سے تھی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اب مجھے درست تلفظ کی مشق نہیں رہی۔“ اس واقعے پر وہ خاصے محظوظ ہوئے اور کئی دوستوں سے اس کا ذکر کیا۔

رالف رسل کی زندگی کے بہت سے دل چسپ واقعات یہاں درج کیے جاسکتے ہیں جو انھوں نے سنائے، لیکن ظاہر ہے ان میں سے اکثر واقعات ان کی سوانح کا بھی حصہ ہیں، اس لیے ان کو دوہرانے کی ضرورت نہیں۔ ایک دو دل چسپ واقعات کا ذکر کر کے میں اپنی بات ختم کروں گی۔

ایک دن معروف تاریخی ناول نگار ولیم ڈیلمیر پل نے مجھے اور رالف رسل کو لچ پر مدعو کیا۔ یہ غالباً ۸ جون کی بات ہے، ۸ جون کو مجھے ہندوستان واپس لوٹنا تھا۔ میں نے ولیم کے لیے کچھ ترجمہ کیا تھا جس کا پے منٹ بھی انھیں کرنا تھا۔ طے یہ ہوا کہ وہ رالف رسل کے نام چیک کاٹ دیں گے اور رالف اتنی ہی رقم مجھے نقد ادا کر دیں گے۔ واپسی میں ہم جب کلیم جکشن پر اترے تو بینک بند ہونے میں تھوڑی ہی دیر تھی۔ رالف نے کہا میں دوڑ کر بینک جاتا ہوں تم آرام سے گھر پہنچو۔ میں نے کہا میں بھی ساتھ ساتھ چلتی ہوں۔ لیکن میں یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ میرے تیز قدموں سے چلنے کے باوجود رالف مجھ سے بہت آگے نکل گئے اور اپنے بینک کی طرف مڑ گئے۔ اس وقت ان کی عمر ۸۶ سال تھی اور میں ان سے عمر میں ۵۱ برس چھوٹی۔ اس عمر میں بھی ان میں بلا کی انرجی تھی۔ وہ اپنے سارے کام خود کرتے تھے اور کام کرتے ہوئے ان کے لبوں پر کسی نہ کسی نغمے کی دھن رہتی تھی۔ ان کو گیت گانا، سیٹی بجانا اور دوڑنا بہت پسند تھا۔ ایک دن ہم ASDA یا Marks and Spencer سے کھانا لے کر لوٹ رہے تھے کہ اچانک بارش ہونے لگی۔ میں نے جلدی جلدی قدم اٹھانے شروع کیے تو رالف بولے، اگر تمہارا دل چاہتا ہے تو دوڑو۔ میں ہنسنے لگی۔ میں کوئی بچہ ہوں جو بارش میں بھگیتے ہوئے دوڑوں گی۔ اس پر انھوں نے اپنے علی گڑھ کے قیام کا ایک واقعہ سنایا۔ کہنے لگے کہ میری یہ عادت تھی کہ چلتے ہوئے اگر میں یہ محسوس کرتا کہ جلدی کرنی چاہیے تو میں سڑک پر دوڑنا شروع کر دیتا تھا۔ اور اکثر چلتے ہوئے سیٹی بجاتا تھا۔ علی گڑھ میں بھی میں ایسا

ہی کرتا تھا۔ ایک دن میرے دوست اسرار نے ٹوکا، ”سنو، رالف! یہاں کوئی شریف آدمی نہیں دوڑتا اور کوئی شریف آدمی سیٹی نہیں بجاتا۔“ میں نے کہا اچھی بات ہے، اگر ایسا ہے تو میں فوراً دوڑنا اور سیٹی بجانا چھوڑ دوں گا۔ یہ واقعہ سنا کر رالف خوب ہنسے۔

اس طرح کے بہت سے واقعات اور لطیفے رالف رسل کو یاد تھے، جو وہ بے تکلف سناتے اور خوب ہنستے تھے۔ ان میں سے بہت سے انھوں نے اپنے مضامین میں لکھے بھی ہیں جو *Annual of Urdu Studies* میں ”شادم از زندگی خویش“ (سوانحی مضامین کا سلسلہ) میں شائع ہوئے ہیں۔ زندہ دلی ان کی رگ رگ میں سمائی تھی۔ لیکن یہ ان کی زندگی کا صرف ایک پہلو ہے، اگر آپ ان کی سوانح پڑھیں تو اندازہ ہوگا کہ یہ زندہ دلی، زندگی کے تئیں ان کے بے حد سنجیدہ رویے اور کچھ اصولوں کے ساتھ مربوط تھی۔ اپنے اصولوں کی قیمت پر انھوں نے کبھی مفاہمت نہیں کی۔ زندگی کرنے کا ان کا ایک نظریہ تھا، اور اپنا یہ موقف انھوں نے پندرہ سے سترہ برس کی عمر کے دوران طے کر لیا تھا۔ عمر کے پختہ ہونے کے ساتھ اپنے نصب العین پر ان کا یقین مستحکم ہوتا گیا اور وہ ہمیشہ اس پر کاربند رہے۔ یہ موقف انسانیت پر اعتماد اور انسان دوستی کا ہے جس نے انھیں اشتراکیت کی راہ پر ڈالا۔ سچی انسانی قدروں پر اس اعتماد نے ہی ان کو ہندوستان کی آزادی کی تحریک کا نہ صرف حامی بنایا بلکہ ان کو یہ سوچنے کی صلاحیت دی کہ آزاد ہندوستان میں عام آدمی، سپاہی، کسان اور مزدور کا کیا رول ہونا چاہیے۔ رالف رسل ویسے تو برطانوی فوجی افسر تھے لیکن ان معاملات پر ہمیشہ غور کرتے رہتے تھے، جب جب موقع ملتا ہندوستانی کمیونسٹوں سے ملنے اور ان کا موقف جاننے کی کوشش کرتے، اپنے خیالات سے ان کو آگاہ کرتے اور اپنی تجاویز لکھ لکھ کر دیتے تھے۔ ایک سچے تنظیم کار کی طرح انھوں نے اپنے فوجی یونٹ کے سپاہیوں میں آزادی کے لیے بیداری لانے کی ہر ممکن کوشش کی۔ یہ ایک بے حد پرخطر کام تھا۔ پتا لگنے یا جاسوسی کی صورت میں ان کو غدار قرار دیا جاسکتا تھا، لیکن وہ جتنے دن ہندوستان میں رہے بے حد محتاط انداز میں سپاہیوں کے درمیان کام کرتے رہے۔ ان کو یقین تھا کہ فوج سے واپس لوٹنے کے بعد ان کے یونٹ کے کچھ نہ کچھ سپاہی ضرور اپنے لوگوں کے لیے سیاسی کام کریں گے۔

۱۹۴۶ء میں برطانیہ واپس لوٹنے کے بعد رالف رسل نے لندن یونیورسٹی کے سوائس میں تین سال تک اردو پڑھی اور سیاسی کام بھی کیا، پھر سوائس ہی میں اردو کے استاد مقرر ہو گئے۔ لیکن اپنا عہدہ سنبھالنے سے پہلے وہ ایک سال کی تعلیمی رخصت لے کر اردو دانوں کے ساتھ رہ کر اردو پڑھنے کے لیے علی گڑھ آئے۔ اس قیام کے دوران اردو کی دنیا سے ان کا جو رشتہ قائم ہوا وہ زندگی بھر کے لیے تھا۔ اپنی زندگی کی تین اہم منازل کا ذکر کرتے

ہوئے رالف رسل نے اپنی سوانح کے چودھویں باب میں لکھا ہے:

میری زندگی کے تین مرکزی پہلو ہیں — اُن بنیادی اقدار کے تئیں میری وفاداری جنہوں نے مجھے کیونٹ بنایا، اردو کا مطالعہ اور سچی انسانیت کی بنیادی خصوصیت کے طور پر محبت کے جذبے کا عرفان۔ (اردو شاعری کے مطالعے نے اس احساس کو واضح کرنے میں مدد کی کہ انسان بننے کے لیے محبت کرنا بنیادی طور پر لازمی ہے اور یہ کہ ایک معنی میں یہ بات غیر اہم ہے کہ آپ کس سے محبت کرتے ہیں اور اس کے اظہار کے کتنے مواقع آپ کو ملے ہیں؛ بنیادی بات تو محبت کرنا ہے)۔ میرے بیش تر احباب اور رفقاءے کار کا واسطہ میری زندگی کے کسی ایک ہی پہلو (یا زیادہ سے زیادہ دو پہلوؤں) سے پڑا ہے۔ خواہ ان میں کوئی مجھ سے کتنا ہی قریب کیوں نہ ہو۔ میرے کیونٹ دوست میرے اردو کے کام کے بارے میں تقریباً کچھ بھی نہیں جانتے اور نہ ہی انھیں اس کو جاننے میں مطلق کوئی دل چسپی ہوگی؛ میرے رفقاءے اردو کے حلقے میں یہ بات بہ مشکل ہی کسی کے ذہن میں آتی ہے کہ میں کیونٹ ہوں۔

رالف نے انگریزی دانوں کے درمیان اردو اور اپنے پسندیدہ شاعر غالب کو مقبول بنانے اور معروف کرانے کا کام بھی اسی سنجیدگی سے عبادت کی طرح کیا۔ اردو کے ترویج کی ان کی کوششیں عملی ہیں — بہ حیثیت استاد بھی اور بہ حیثیت تنظیم کار بھی۔ غالب سے عشق ان متعدد کتابوں کی صورت میں ظاہر ہوا ہے جو انھوں نے وقتاً فوقتاً آکسفورڈ یونیورسٹی پریس اور دوسرے اشاعت گھروں سے شائع کرائی ہیں۔ ان کی کم از کم چھ کتابیں غالب پر ہیں، جن میں اردو اور فارسی شاعری اور خطوط کے ترجمے بھی شامل ہیں، غالب کی سوانح بھی اور تنقیدی مضامین بھی۔ بیسویں صدی میں عالمی پیمانے پر غالب کو اس کا مقام دلانے میں رالف رسل کی کاوشوں کو نمایاں مقام حاصل ہے۔ اس کے علاوہ میر، سودا اور میر حسن پر ان کی مشہور زمانہ کتاب *Three Mughal Poets* نے، جو انھوں نے خورشیدالاسلام کے اشتراک سے لکھی، لیجینڈ کی سی حیثیت حاصل کر لی ہے۔ یہ بات درست ہے کہ اردو دنیا کے لیے ان کا مقام اردو کے ایک پرستار اور مترجم کا ہے لیکن رالف رسل کو قریب سے جاننے والے جانتے ہیں کہ یہ ان کی زندگی کا محض ایک پہلو ہے، جو بے شک اہم پہلو ہے، لیکن بہ حیثیت انسان ان کی زندگی اور زندگی کے تئیں ان کے رویے بھی زیادہ نہیں تو یکساں طور پر قابلِ قدر ہیں۔

لندن سے لوٹنے کے بعد ہم لوگوں کا رابطہ بذریعہ ای۔ میل قائم رہا۔ انھوں نے مجھ کو اپنے ان قریبی دوستوں کی فہرست میں شامل کر لیا تھا جن کو وہ اپنا جزل بھیجتے تھے۔ اس سے ان کے معمولات اور سرگرمیوں کا علم

ہوتا رہتا تھا۔ اس کے بعد ان کے ساتھ ای۔میل پر ہمیشہ رابطہ رہا۔ میری طرف سے لکھنے میں کوتاہی ہوتی تو وہ ہمیشہ متفکر ہو جاتے اور ان کا ای۔میل آتا تھا کہ صرف خیریت کی اطلاع دے دوں، تفصیلی خط بعد میں لکھتی رہوں۔ اپنے ۶ مئی ۲۰۰۸ کے جرنل میں رالف نے لکھا تھا کہ ۳۰ اپریل کو چیک اپ کے بعد ڈاکٹر نے بتایا تھا کہ کینسر پھیلنا شروع ہو گیا ہے، اور اس کے پھیلنے کی رفتار کو تھوڑا بہت کنٹرول تو کیا جاسکتا ہے لیکن روکا نہیں جاسکتا۔ یہ اطلاع ان کے لیے حیران کن تھی۔ غالباً اس لیے بھی کہ عمومی طور پر ان کی صحت کافی عمدہ تھی۔ وہ تنہا رہتے تھے اور اپنے تمام کام خود کرنے کے عادی تھے۔ ڈاکٹر کے ہاں ان کی شاگرد اور دوست میرین مولٹینو ساتھ گئی تھیں۔ ان کو رالف کی صحت کا زیادہ اندازہ تھا، اس لیے ڈاکٹر کی اطلاع پر انھیں زیادہ حیرت نہیں ہوئی۔ بہر حال ان دونوں نے ڈاکٹر سے بہ اصرار پوچھا کہ ان کو بتایا جائے کہ اب ان کے پاس کتنا وقت ہے۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ زیادہ سے زیادہ چھ سے آٹھ مہینے کی مہلت ملے گی۔ اس خبر کو سننے کے بعد رالف نے اپنے قریبی دوستوں کو یہ تمام حالات لکھ دیے اور اپنے اہورے کاموں کو زیادہ تنظیم کے ساتھ نمٹانا شروع کر دیا۔

انتقال سے کوئی ایک مہینہ پہلے ان کے ای۔میل آنا بند ہو گئے تھے۔ آخری ای میل ۱۲ اگست کو آیا تھا جس میں انھوں نے اطلاع دی تھی کہ وہ اپنی سوانح کی دوسری جلد کے صفحات فائل کرنے کا کام کر رہے ہیں، اسی دن انھوں نے اپنے جرنل یعنی ڈائری کی آخری قسط بھی بھیجی تھی۔ ۱۱ ستمبر کو ان کے بیٹے ای ان (Ian) کے ای۔میل سے اطلاع ملی تھی کہ ۴ ستمبر کو ان کو اسپتال میں داخل کیا گیا تھا، اور چیک اپ کے بعد پتا چلا کہ ان کا کینسر جگر تک پھیل گیا ہے۔ اور جیسا کہ ڈاکٹروں کا اندازہ تھا، رالف رسل ٹھیک ساڑھے چار مہینے بعد ۱۳ ستمبر کو چل بے۔ ان کی صحت کے بارے میں ان کے دوستوں کو ای۔میل کے ذریعے باخبر رکھنے کی ذمہ داری ان کے بیٹے ای ان نے لے لی تھی۔ انھوں نے ہی آخری رسوم کی تیاریوں سے متعلق ہر فیصلے سے ہمیں باخبر رکھا۔ رالف رسل کی آخری رسوم ۲۲ ستمبر کو دوپہر دو بجے ٹوئنگ کے لمبیتھ کریمٹوریم میں ادا کی گئیں۔ عیسائی طریقے سے تدفین میں غالباً ان کی کوئی دل چسپی نہ تھی۔ رالف کی پسند اور مزاج کے مطابق ان کے بچوں نے ان کے جنازے کے ساتھ ان کا پسندیدہ نغمہ "I'm Against It" گانے کا اہتمام کیا تھا۔ گیت کا پہلا بند اس طرح ہے:

I don't know what they have to say

It makes no difference anyway:

Whatever it is, I'm against it.

No matter what it is or who commenced it:

I'm against it.

یہ گیت رالف نے مارکس برذرز کی فلم *Horse Feather* سے سیکھا تھا۔ ان کے بیٹے ای ان نے نغمے کے بول اور دھن رالف کے پیش تر دوستوں کو ای۔ میل کے ذریعے بھیج دی تھی، جب کہ رالف کے چند موسیقار دوستوں اور بیٹے نے گانا اٹھانے کی ذمہ داری لی تھی تاکہ جنازے میں شامل سب لوگ آسانی سے گاسکیں۔ رالف طبعاً زندہ دل اور خوش مزاج تھے اور اپنے روزمرہ کے کام نمٹاتے ہوئے ہمیشہ کچھ نہ کچھ گنگناتے یا سیٹی میں دھنیں بجاتے رہتے تھے۔ کیونکہ کی طرح گانے کی یہ عادت ان کو کم عمری میں پڑ گئی تھی اور آخر تک ان کے ساتھ رہی۔ انتقال سے ایک دن پہلے انھوں نے ای ان سے کہا تھا کہ بولنے کے مقابلے میں میرے لیے گانا زیادہ آسان ہے۔ گانے کے ساتھ ان کی طبیعت مناسب اور دل چسپی کے مد نظر ان کے دوستوں اور بچوں نے رالف کو الوداع کہنے کا جو طریقہ اختیار کیا اس سے بہتر کوئی اور طریقہ اختیار کرنا ممکن نہ ہو سکتا تھا۔ □



(ہندستان میں ایسے لوگ چند ہی تھے جن سے اواخر عمر میں رالف رسل نے رابطہ رکھا۔ ان کی سوانح کے ترجمے کے سبب حالات ایسے بن گئے تھے کہ غالباً میں ہی سب سے زیادہ اور مستقل طور پر ان کے رابطے میں تھی۔ چنانچہ ان کے انتقال پر ہندستان کے کئی معتبر رسالوں کے لیے تعارفی مضامین تحریر کیے۔ ان میں کم و بیش ان تمام باتوں کا احاطہ کیا جو میں نے ان کی شخصیت میں محسوس کیں۔ اب ان سب مضامین میں شامل مواد پر مشتمل یہ مبسوط مضمون ”سالنامہ دراسات اردو“ کے لیے از سر نو مرتب کیا ہے۔

ہندستان کے اخباروں میں رالف رسل کے انتقال کی تاریخ ۱۵ ستمبر شائع ہوئی تھی۔ اسی کنفیوزن میں میرے کئی مضامین میں یہی تاریخ شائع ہوئی۔ ان کا انتقال درحقیقت ۱۳ ستمبر کو ہوا تھا، یہ بات رکارڈ میں لانا ضروری ہے۔)